مختصر افسانہ

مختصر افسانہ جدید دور کی اہم نثری صنف ہے۔ اِس کے ذریعے کسی شخص کی زندگی کے ایک اہم پہلو یا کسی واقعہ کا بیان اس طرح کیا جاتا ہے کہ پڑھنے والے کے دل و دماغ پر اُس کا اثر گہرا پڑے۔

افسانے کی متعدد تعریفیں کی گئی ہیں۔ ایک نقّاد کا کہنا ہے کہ افسانہ ایسی نثری کہانی ہے جو ایک ہی نشست میں پڑھی جا سکے۔ ایک اور نقّاد کا کہنا ہے کہ افسانہ ان کہانیوں سے بالکل مختلف ہے جو اتفاق سے کہانی ہونے کے علاوہ مختصر بھی ہوتی ہیں۔ یہ کہانی کی ایک واضح فنّی صورت ہے۔ ایجاز و اختصار، جدّت، فنّی حُسن اور تخیّل کی چاشنی اِس کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ افسانہ سیدھی سادی کہانی نہیں بلکہ ایسی فنّی تخلیق ہے جس میں فن کار کے ارادے اور حکمت کو دخل ہوتا ہے۔ کسی مخصوص واقعے یا صورت حال یا کسی مخصوص کردار کا نقش اس طرح ابھارا جاتا ہے کہ پلاٹ یعنی واقعات کی ترتیب و تنظیم پڑھنے والے کو متاثر کر سکے۔

افسانے کے ماہروں نے اس کی جو تعریفیں بیان کی ہیں اُن سے واضح ہوتا ہے کہ افسانہ بیانیہ تخلیقی تحریر ہے۔ افسانے میں کسی ایک کردار یا کرداروں کے ایک مخصوص گروہ کے نقوش یا ذہنی کشمکش کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ افسانے میں واقعات کی تفصیل، کرداروں کی گفتگو اور منظر و ماحول کی پیشکش بہت نپی تلی ہوتی ہے۔

ہر افسانے کے لیے پلاٹ، کردار اور زمان و مکان لازمی اجزا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی لحاظ سے افسانے کی اقسام بھی بیان کی گئی ہیں یعنی پلاٹ کا افسانہ، کردار کا افسانہ یا پس منظر کا افسانہ۔

© NCERT not to be republished

افسانے کی کامیابی کے لیے کچھ ناقدین، افسانہ نگار کے نقطۂ نظر کو بھی اہم قرار دیتے ہیں۔ افسانہ نگار کے اسلوب میں رمز، کنایے اور تاثیر کو بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔

اردو میں مختصر افسانے کا آغاز بیسویں صدی کے ساتھ ہوا۔ ہندوستان میں کتھا کہانی کا رواج تو صدیوں پرانا ہے، اسی طرح عربی اور فارسی میں داستان اور قصص کی روایت ملتی ہے لیکن مختصر افسانے کی صنف اردو میں مغرب کے اثرات کی دین ہے۔ اردو میں سب سے پہلے پریم چند اور یلدرم نے افسانے لکھے۔ ان کے فوراً بعد کئی افسانہ نگار مختلف طرزوں میں نمایاں ہوئے مثلاً ل۔ احمد اکبرآبادی، نیاز فتح پوری، حجاب امتیاز علی وغیرہ نے اردو افسانے کو نئی جہت عطا کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے افسانہ اردو فکشن کی مقبول ترین صنف بن گئی۔

1936 میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ اس سے چند برس پہلے ''انگارے'' کے نام سے باغیانہ کہانیوں کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا تھا۔ ان کہانیوں نے موضوع اور فن دونوں اعتبار سے نئے تجربوں کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بہت پہلے پریم چند (1880 تا 1936) نے اردو افسانہ نگاری کو عروج پر پہنچا دیا تھا۔ پریم چند نے حقیقت نگاری اور نفسیاتی کردار نگاری کے ساتھ مشرقی یوپی کے دیہاتوں کی زندگی اور قومی زندگی میں نمایاں ہونے والے سیاسی اور حُرّیتی جذبات کو بھی نمایاں کیا۔ چند ہی برسوں میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، غلام عبّاس، احمد ندیم قاسمی اور بلونت سنگھ کے ہاتھوں اردو افسانے نے بہت ترقی کی۔ زندگی کے گوناگوں مسائل اور موضوعات پر لکھا جانے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ انسان دوستی، سماجی اصلاح اور قومی شعور کے اظہار کا چلن بھی عام ہوا۔

آزادی کے بعد اُبھرنے والے افسانہ نگاروں میں قرۃ العین حیدر نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ 1960 کے لگ بھگ اردو میں علامتی افسانے کا آغاز ہوا۔ اس رنگ کے نمائندہ افسانہ نگار: انتظار حسین، سریندر پرکاش، انور سجّاد، بلراج مین را اور خالدہ حسین ہیں۔ حقیقت نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے والوں میں حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس، احمد ندیم قاسمی،

© NCERT not to be republished

شوکت صدیقی، اشفاق احمد، رام لال اور جوگندر پال قابلِ ذکر ہیں۔ نئی نسل کے کئی افسانہ نگاروں نے براہ راست طرزِ بیان کے بجائے علامتی طرزِ بیان کو ترجیح دی۔ لیکن علامتی اور تجریدی افسانوں کی مقبولیت اب پہلی جیسی نہیں رہی۔

© NCERT not to be republished

سیّد رفیق حسین

(1946 — 1894)

سیّد رفیق حسین لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں ہندوستان کے مختلف مقامات پر مقیم رہے۔ شکار کے شوق کے ساتھ ساتھ انھیں حیوانوں کی فطرت کے مطالعے کا ذوق بھی تھا۔ انھوں نے جانوروں کی نفسیات پر متعدد افسانے لکھے۔ جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے مختلف اور منفرد ہیں۔ اُن کے افسانوں کا مجموعہ ''آئینہ حیرت'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ یہی مجموعہ ''شیر کیا سوچتا ہوگا'' کے نام سے بھی طبع ہوا۔ ان کی زیادہ تر تحریریں، جانوروں کی فطرت اور عمل کی عکاسی کرتی ہیں۔

رفیق حسین کے افسانوں میں مناظرِ فطرت کی ایسی حسین اور سچّی تصویریں ملتی ہیں جن کی نظیر اردو میں کہیں اور نظر نہیں آتی۔ الفاظ کے صوتی آہنگ سے تاثر پیدا کرنے میں رفیق حسین کو کمال حاصل ہے۔ مختلف جانوروں کی آوازیں، پرندوں کی بولیاں، پانی کے بہنے کا شور، ہوا کے چلنے کی دھیمی اور تیز آوازیں، جنگل کی سائیں سائیں سب کچھ اُن کے افسانوں میں موجود ہے۔ موزوں الفاظ کے توسط سے رفیق حسین اپنے قاری کو جنگل کی دُنیا میں لے جا کر تمام آوازیں سُناتے ہیں۔

افسانہ ''گوری ہوگوری'' کا بنیادی کردار گوری نام کی ایک گائے ہے جو وفاداری اور ایثار کا پیکر ہے۔ رفیق حسین نے سیلاب کے پس منظر میں گوری کا کردار اس طرح اُبھارا ہے کہ وہ محبت اور مامتا کی علامت بن کر دل پر اثر کرتی ہے۔

© NCERT not to be republished

گوری ہو گوری

چوما سے کی اندھیاری رات تھی۔ بھیگی بھیگی ٹھنڈی ہوا چلتی تھی۔ جھینگروں نے جھنکار مچا رکھی تھی۔ مینڈک بول رہے تھے: ٹر، ٹر، ٹر۔ پیپل کے سوکھے ڈگالے پر الّو کہتا تھا: ہک ہؤ ہک ہؤ۔

بسنتی نے کروٹ لی، پھر منھ پر تھپّڑ مارا۔ بولی: ''ہائے رے۔ ارے رام کیسے ڈانس لاگیں۔''

چھ مہینے کا بچّہ پاس لیٹا تھا، اس پر ہاتھ رکھ لیا اور بسنتی بولی: ''مری جائے، پھر آئے بیٹھا، بولت کیسے ناس پیٹا۔''

''ہک ہؤ، ہک ہؤ''

''اجی، او جی اٹھونا۔ گھگو بولے۔ موہے ڈر لاگے۔ تنی اُڑائے دے۔''

مادھو آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ کھٹیا سے نیچے پیر لٹکایا، جلدی سے پھر اوپر کھینچ لیا۔ گھبرا کر پھر نیچے دیکھا۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھا۔ چھوٹا سا کچّا گھر تھا۔ چھوٹی چمنی کے دھوئیں سے کالی لالٹین تھی۔ دھیمی روشنی میں آنگن بھر جھل جھلا رہا تھا۔ گھر بھر میں پانی بھرا تھا۔

مادھو بولا: ''جو کا ہُوا رے۔''

بسنتی گھبرا کر اُٹھی۔ بولی: ''اجی دیکھت کا ہو۔ ہرے رام بھیکا کو جگالو۔ ارے رم کلیا کو جگالو۔ پانی آئے گیا رے۔ ارے او بھیکا۔ رام کلیا ہو۔ اری او رم کلیا۔''

آٹھ برس کی دُبلی پتلی رم کلیا جاگی۔ چھ برس کا بھیکا جاگا، دودھ پیتا پاس لیٹا بچّہ جاگا۔ یہ رویا، وہ چلّائے۔

''چُپ کرو چُپ۔'' مادھو نے ڈانٹا۔ خاموشی میں مادھو نے کان لگائے۔ بسنتی نے دھیان

© NCERT not to be republished

دیا۔دور کہیں سے آواز آ رہی تھی: گڑپ شل شل شل۔گڑپ شل شل شل۔

گھگو بولا: ''ہک ہؤ!''

کھٹولے سے کود، پانی میں چھپ چھپاتے بچّے ماں سے چمٹے۔مادھو اُٹھا۔ دیکھنے کو دروازے کی طرف چلا۔بسنتی روئی۔''اجی جاوت کہاں ہو جی۔''

باہر سے آواز آئی ''مادھو بھیّا ہو۔او مادھو۔ارے باڑھ آئی۔اُٹھ رے اُٹھ۔''

''شڑپ گڑپ، شل شل شل۔'' پانی کے بہنے کی آواز تیزی سے بڑھ رہی تھی۔

''مم ...مم... میں۔'' بکری بولی۔ہاں ہاں آں۔کہیں گئیاں چلّا رہی تھیں۔بارہ گھر کے گوجر پروے میں ہل چل مچ گئی۔سب جاگ اُٹھے۔سب بھاگنے لگے۔کوئی پکارتا تھا۔کوئی چلّاتا تھا۔کوئی روتا تھا۔

مادھو نے رم کلیا کو کوٹھے کی سیڑھیوں پر کھڑا کر دیا۔بھیکا کو گود میں لیا اور سامان رکھنے اور اُٹھانے میں لگ گیا۔بسنتی نے گود والی لڑکی کو دبائے دبائے تیرتی ہنڈیا پکڑ لی۔مٹکا کترایا ہُوا پرے سے نکلا جاتا تھا۔اسے پیر سے روکا۔

گھر کے باہر آدمی اور جانور چلّا رہے تھے۔گھر کے اندر رم کلیا اور بھیکا رو رہے تھے۔پانی کا شور اندر اور باہر سب جگہ تھا۔بسنتی اور مادھو گھر کے سامان میں لگے تھے۔شور ہُوا: ''بھاگو۔او بسنتی نکل۔ارے مادھو بھاگ۔''

پانی نے ہچکولا لیا۔پنڈلی سے اُچکا۔رانوں تک آیا۔

''بھاگو، بھاگو۔مادھو بھیّا بھاگو رے۔ارے کا ہوئے گیا۔نِکلت کا ہے نا ہیں۔''

باہر سے آوازیں آئیں۔پانی نے پھر ہچکولا لیا۔آگے بڑھا۔پیچھے ہٹا اور ران سے کمر تک آیا۔

بسنتی روئی۔''ارے مورے کڑوے، اری موری ہنسلی تو نکال لے رے۔''

''چل چل تو چل نکل۔میں لایا۔ارے نون چون تو لیے لوں۔اوڑھنا بچھورا تو دبائے لوں۔''

پانی کا شور تھا۔ چار آدمیوں کا چلانا تھا۔ دروازے پر دھکے تھے۔ وہ کھل گیا۔ آدمی گھر میں آ گئے۔ مادھو اور بسنتی کو پکڑ کر گھسیٹا۔ ''چالو چالو سب چھوڑو، جان ہی بچائے لو، چالو چالو۔''

اس گڑبڑ میں، جلدی میں، گھبراہٹ میں، اندھیرے میں، دری، بچھورے کپڑوں کے لیے پکارتی، برتنوں اور زیوروں کے لیے پھڑکتی، بسنتی نے یہ بھی کہا: ''بھیارے رم کلیا کو لے لے رے۔'' لالٹین ڈوب چکی تھی۔ اندھیرے میں کسی نے جواب دیا: ''موں اُٹھائے لوں۔ تو تو چل۔ اری نکس باہرے۔''

پانی کی شل شل، رات اندھیری، بادل کی گرج۔ کمر کمر، سینے سینے پانی میں بیس تیس آدمی، پچاس ساٹھ مویشی چلے۔ ہر آدمی بول رہا تھا۔ ہر جانور چلّا رہا تھا۔ کوئی گرتا تھا، سنبھالتا تھا۔ کوئی ڈوبتا تھا، دوسرا اُبھارتا تھا۔ شروع میں تو سب جتھا بنائے ایک دوسرے کو سنبھالتے پُروے سے باہر چلے۔ آموں کے باغ کے اندر سے آ کر پون میل کے فاصلے پر ریل کی پٹری کا رُخ کیا۔ لیکن جوں جوں آگے بڑھتے گئے اندھیرے میں ایک دوسرے سے الگ ہوتے گئے۔

اندھیری رات تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ پانی کمر کمر اونچا تھا۔ ساتھی سب بچھڑ بچھڑ کر الگ ہو گئے تھے۔ اِدھر اُدھر۔ دؤ راور نزدیک آوازیں ان کی آ رہی تھیں:

''جانکی ہو جانکی!''

''آئے رہوں دادا!''

''مُرلی ہو مُرلی!''

''بھلا رے بھلا۔ چالے چالو!''

ڈکراتی بھینسیں، چلاتی گائیں، ممیاتی بکریاں، روتے بچّے، سہمی عورتیں، پکارتے مرد، سب بھیگے، سب پانی ٹپ ٹپاتے ریل کی پٹری پر چڑھے۔ اندھیری رات میں سؤنی پٹری آباد ہو گئی۔ لوگوں نے گلے پھاڑ پھاڑ کر پوچھنا شروع کر دیا کہ کون کون آ گیا ہے اور کون کون رہ

© NCERT not to be republished

گیا۔ ہر کسی کو کسی نہ کسی کی فکر تھی۔ چھوٹے سے پروے کی پوری آبادی کی مردم شماری کی گئی۔ آدمیوں اور جانوروں دونوں کی گنتی کی گئی۔ جانور سب موجود تھے۔ آدمیوں میں ایک ...کا لڑکا اور بچّوں میں رم کلیا کم تھی۔

بسنتی نے رم کلیا کے واسطے بِلک بِلک کر رونا شروع کر دیا۔ مادھو بھی چپکا کھڑا روتا تھا۔ وہیں پر اُن کی گوری گائے کھڑی ارّاتی تھی: ''تو کاں آں ھ۔ تو کاں آں ھ۔'' یہ بھی دُکھ پیٹی ماں ہے۔ ارے کوئی جانے یا نہ جانے بچھڑا اِس کا بھی نہیں ملتا ہے۔ دُکھیا روتی ہے: ''تو کاں آں ھ۔''

روتی ہچکیاں لیتی بسنتی کے پاس بولتی ہوئی گائے آئی۔ بسنتی نے اس کی گردن میں باہیں ڈال دیں اور روئی:

''گوری رے موری رم کلیا.....ایھ ایھ ایھ ایھ''

''گوری رے اب تو ہے کون چَرائے ..... ایھ ایھ ایھ ایھ''

''گوری توری رم کلیا تو گئی رے ..... ایھ ایھ ایھ ایھ''

''گوری توری رم کلیا..... ابھ ابھ ابھ ابھ۔''

گائے نے وہی لمبی آواز نکالی ..... ''تو کاں آں ھ''

کوئی جانے نہ جانے۔ دل کی لگی رام جانے۔ گائے نے چِلّا چِلّا کر اور بسنتی نے سسکیاں لے کر آخر صبح کر ہی دی۔ نکلتے دن کی پہلی روشنی میں سب کی آنکھیں گوجر پروے کی طرف اُٹھ گئیں: سامنے چھوٹا سا آموں کا باغ تھا۔ اسی کے برابر اور کچھ اس کی آڑ میں گوجر پروا آباد تھا۔ لیکن اب وہاں کچھ نہ تھا۔ اگر کوئی بچا کھُچا مکان ہوگا تو درختوں کی آڑ میں ہوگا۔ سامنے تو باغ ہی باغ تھا جس کے درخت اپنے ہرے ہرے ہاتھ پانی پر پھیلائے مل رہے تھے اور پھر ان کے پار میلوں میلوں جہاں جہاں تک نظر جاتی پانی ہی پانی تھا۔

جب تک اندھیرا رہا ہڑپ، گڑپ گڑاپ کرتے پانی نے رم کلیا کو خوب ہی ڈرایا اور روتے روتے بے دم، گز بھر کی لڑکی کا آنے والے دن نے بھینی بھینی روشنی پھیلا کر دل ہی دہلا

© NCERT not to be republished

دیا۔ایک دفعہ ہی چونک کر دیکھتی ہے،تو نہ مکان ہیں نہ گاؤں ہے۔آدھے سے زیادہ کوٹھا بہہ چکا ہے۔ایک کونے پر خود بیٹھی ہے۔دوسرے کونے پر کالا سانپ کنڈلی مارے، بل کھایا بیٹھا دُہری زبان نکال رہا ہے۔سامنے چاروں طرف پانی ہی پانی ہے۔

رم کلیا نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں موند لی تھیں اور ''اری میّا ری ... او میری میّا۔'' کہہ کر بلک رہی تھی کہ اس کے کان میں آواز آئی: ''تو کاں آں ھ۔'' رم کلیا چونکی۔ہاتھ آنکھوں پر سے ہٹے۔آنسو بہتے مُردہ چہرے پر ہلکی مسکراہٹ آئی۔

''تو کاں آں ھ۔'' آواز پھر آئی۔

رم کلیا نے ''ہرے رام گوری بولے۔'' کہتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔گائے دکھائی تو دی نہیں لیکن رم کلیا نے اپنی پوری طاقت سے پکارا ''گوری، ہو گوری!''

جواب آیا: ''تو کاں آں ھ''

اور پھر باغ میں سے تیرتی ہوئی گائے نکلی۔رم کلیا نے پھر پکارا۔وہ اسی کی طرف بولتی ہوئی بڑھی۔لیکن دؤ رسے ایک اور آواز آئی: ''او ماں آں ھ۔''

باغ کی آڑ سے بچھڑے کی آواز تھی۔گائے اُس آواز کی طرف گھوم پڑی۔رم کلیا کا ننّھا سا دل بیٹھنے لگا۔وہ رات بھر رونے اور ہچکیاں لینے سے تھک چکی تھی۔پھر بھی اپنی سکت بھر چلاّئی:

''گوری، ہو گوری!''

''گوری، ہو گوری!''

''ارے گوری رے، آئے جا!''

''گوری میّا، آئے جا ری!''

لیکن گوری نے رُخ نہ بدلا۔البتہ دو چار دفعہ سر گھما کر رم کلیا کی طرف دیکھا۔ارّا کر بولی اور پھر اُدھر ہی تیرتی چلی گئی جدھر سے بچھڑے کی آواز آ رہی تھی۔

باغ کی آڑ سے نکلتے ہی گائے کو بچھڑا، اسی جگہ تیرتا ہوا نظر آیا، جہاں سرِ شام وہ، اس کا بچھڑا اور بیل باندھے گئے تھے۔اب وہاں نہ کھیت تھا نہ جھونپڑی۔جگہ وہی تھی۔لیکن اب

© NCERT not to be republished

سوائے پانی کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ بچے کی آواز کا جواب دیتی، تیرتی تیرتی اس کے پاس گئی۔ چاروں طرف گھومی۔ اسے سونگھا۔ ایک دفعہ اس کی تھوتھنی بھی چاٹ لی اور پھر ایک طرف کو تیرتی چلی گئی مگر بچّہ نہ چلا۔ وہیں تیرتا رہا۔ گائے پھر لوٹ آئی۔ چاروں طرف گھومی۔ برابر آ کر اپنی کمر اور پیٹ سے اسے ڈھکیلا۔ ایک طرف چلی، بچّہ ساتھ نہ آیا تو پھر لوٹ آئی۔ اب وہ کچھ سمجھ گئی۔ بچّہ چھ فٹ زمین میں گڑے ہوئے گھونٹے میں رسّی سے بندھا ہوا تھا۔ اور رسّی بس اس قدر لمبی تھی کہ اب تک تو کسی نہ کسی طرح بچھڑے کی ناک پانی سے باہر تھی۔ لیکن اگر پانی ایک انچ بھی اور بڑھ جائے تو رسّی کی وجہ سے ناک ڈوب ہی جائے۔ گائے نے مایوس ہو کر، چلّاتے بچّے کو وہیں چھوڑا اور پھر رم کلیا کی طرف رُخ کیا۔

رم کلیا، رونے چلانے کی تھکن، ڈر، خوف اور آخر میں انتہائی نا اُمیدی کا اب تک مقابلہ کرتی رہی تھی۔ لیکن آخر آٹھ برس کی ننّھی جان ہی تو تھی۔ گائے جب اس کے پاس آئی تو وہ گرتی ہوئی چھت کے کنارے بے ہوش پڑی تھی۔ گوری نے آ کر کئی آوازیں دیں اور جب بھی رم کلیا کو ہوش نہ آیا تو کھردری گرم گرم زبان سے اس کا منھ چاٹا۔ لڑکی کو ہوش آ گیا۔ پہلے تو ڈری، پھر گوری کو دیکھا۔ ''گوری میّا۔ گوری میّا'' کہتی ہوئی اس کے گلے میں چمٹی۔ گوری نے دو پیر مارے، آگے بڑھی۔ رم کلیا چھت سے گھسٹ کر پانی میں آ گئی۔ اس نے ڈر کے مارے پیر چلائے اور چمٹ چمٹا کر گوری کی پیٹھ پر آ گئی اور وہیں چھپکلی کی طرح لیٹی لیٹی چمٹ گئی۔ گوری پھر بچھڑے کے پاس آئی۔ وہی حرکتیں پھر کیں۔ کئی دفعہ اس کے گرد چکّر لگائے اور چلی۔ جب بچھڑا ساتھ نہ چلا تو لوٹ آئی۔ اب رم کلیا کی بھی سمجھ میں آ گیا کہ کیا بات ہے۔ جیسے ہی ایک دفعہ پھر گائے تیرتی ہوئی بچھڑے کے پاس گئی، رم کلیا نے اوندھے منھ لیٹے لیٹے، ایک ہاتھ بڑھا کر بچھڑے کے گلے سے رسّی کی گانٹھ نکال دی۔ بچھڑا آزاد ہو گیا۔ گائے اور بچھڑا دونوں تیرتے ہوئے چلے۔ رم کلیا گائے پر چمٹی ہوئی تھی۔ باغ اور ریل کی پٹری کی طرف سے دھار چل رہی تھی۔ اس لیے یہ دونوں بہاؤ ہی کی طرف تیرتے چل دیے اور ڈھائی گھنٹے کے بعد بہت چکّر کھا کر پھر، اسی ریل کی پٹری پر چڑھ آئے۔

© NCERT not to be republished

دن کے بارہ بجے جس وقت آگے آگے گوری، پیٹھ پر رم کلیا، پیچھے بچھڑا ''او ماں آں ھ'' کے سوال جواب کرتے گاؤں والوں میں پہنچے تو ہل چل مچ گئی۔لوگ مارے خوشی کے کوُدتے تھے۔بسنتی خوشی کے مارے دھاروں دھار روتی ہوئی، کبھی رم کلیا کو گلے لگاتی تھی، کبھی بچھڑے کو اور کبھی گوری کے چمٹتی تھی اور گائے کہتی تھی:

''تم ماں آں ھ۔ہم ماں آں ھ'' — آواز آئی۔

''بول گوری میا کی جے''

''بول گئوماتا کی جے۔''

مشق

لفظ و معنی

چوماسا	:	برسات کے چار مہینے
ڈگالا	:	درخت کی موٹی ٹہنی
ڈانس	:	بڑا مچھّر
مری جائے پھر آ بیٹھا	:	مر جائے پھر آ بیٹھا
گھُگھو	:	بڑا اُلّو
تنی اُڑائے دے	:	ذرا اُڑا دے
جو کا ہوارے	:	یہ کیا ہوا
اجی دیکھت کا ہو	:	اجی دیکھتے کیا ہو
کھٹولا	:	چھوٹی چارپائی
گئیاں	:	گائیں

© NCERT not to be republished

ارے کائے ہو گیا

نکلت کا ہے نا ہیں : ارے کیا ہو گیا نکلتے کیوں نہیں

کڑوے : کڑا کی جمع کڑے اودھی اور پوری طرز میں زورِ بیان کی خاطر الفاظ یا اسما کے بعد الف یا و الف یا ے سے الف لگاتے ہیں۔ لہٰذا کڑا سے کڑوا اور کڑوا سے کڑوے۔

نون چون : نمک آٹا

اوڑھنا بچھورا : اوڑھنا بچھونا

موں اٹھائے لوں : میں اُٹھا لیتا ہوں

نِکس باہرے : نکل باہر

آئے رہوں : آ رہی ہوں

بھلا رے بھلا : سب ٹھیک ہے

دُکھ پیٹی : دُکھیاری

دھاروں دھار رونا : پھوٹ پھوٹ کر رونا

غور کرنے کی بات

- رفیق حسین کی کہانیوں میں انسان، حیوان، قدرتی طاقتوں اور مناظر کے آپس میں متاثر ہونے کی سچّی عکاسی ملتی ہے۔ اُردو افسانہ نگاری میں یہی ان کی انفرادیت ہے۔
- اِس کہانی میں مامتا کے جذبے کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو انسان تو کیا جانوروں میں بھی موجود ہوتا ہے۔ گوری جو ایک گائے ہے وہ اپنے مالکن کی ممتا کو سمجھتی ہے اور سیلاب میں پھنسے اپنے بچھڑے کو بچانے سے پہلے اُس کی لڑکی رم کلیا کی جان بچاتی ہے۔
- افسانہ نگار نے اودھی کے برمحل الفاظ بکثرت استعمال کیے ہیں۔

© NCERT not to be republished

سوالات

1. مادھو اور بسنتی موسلا دھار بارش میں اپنا گھر چھوڑ کر کیوں بھاگ رہے تھے؟
2. بسنتی کی بات سُن کر گوری نے کیا کیا؟
3. گوری نے رم کلیا کو کس طرح بچایا؟
4. رم کلیا نے گوری کے بچھڑے کو بچانے کے لیے کیا کیا؟
5. مامتا کے جذبے کے آگے تمام جذبات ہیچ ہیں۔ وضاحت کیجیے
6. گوری کے کردار پر مختصراً لکھیے

عملی کام

- اگر آپ گوری کی جگہ ہوتے تو اس وقت کیا کرتے؟ اپنے لفظوں میں لکھیے
- ہم نے کڑا۔ کڑے۔ کڑوے کے بارے میں اوپر لکھا ہے۔ آپ اپنی طرز سے سوچ کر اس طرح کے لفظ لکھیں۔ مثلاً کتاب سے کتب وغیرہ

© NCERT not to be republished

عصمت چغتائی

(1991 — 1915)

عصمت چغتائی جودھ پور، راجستھان میں پیدا ہوئیں۔ بچپن آگرہ اور جے پور میں گزرا۔ اعلیٰ تعلیم علی گڑھ سے حاصل کی۔ بریلی کے ایک گرلز اسکول میں پرنسپل کی حیثیت سے پہلی ملازمت کی۔ اس کے بعد کئی اسکولوں سے وابستہ ہوئیں۔ ممبئی میں اسکولوں کی انسپکٹریس کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ اسی دوران ممبئی کی فلمی دنیا سے رابطہ قائم ہوا اور وہ ملازمت ترک کر کے فلموں کے لیے لکھنے لگیں۔

عصمت چغتائی نے اپنے بڑے بھائی عظیم بیگ چغتائی کی تحریروں سے متاثر ہو کر لکھنا شروع کیا۔ لیکن ان کی تقلید کے بجائے اپنی الگ راہ نکالی۔ متوسط مسلمان گھرانوں کی لڑکیوں اور عورتوں کی نفسیات اور مشاغل پر افسانے لکھے۔ ان کے افسانوں میں متوسط طبقے کے کرداروں کی نفسیات کے ساتھ ساتھ اخلاقی، معاشرتی اور معاشی زندگی کے تمام گوشوں کی تصویر کشی ہے۔ خواتین کی نفسیات اور مسائل پر عصمت سے پہلے بھی افسانے اور ناول لکھے گئے لیکن ان میں سے بیشتر مردوں کی تحریریں تھیں۔ عصمت نے ان مسائل کو ایک عورت ہی کی حیثیت سے دیکھا، سمجھا اور بے باکی سے تحریر کیا۔ بحیثیت استاد، پرنسپل اور انسپکٹر آف اسکول انھوں نے لڑکیوں اور شادی شدہ خواتین کے ساتھ خاصا وقت گزارا تھا۔ اس لیے ان کے مشاہدے میں گہرائی تھی۔ انھوں نے اپنے ذاتی تجربوں اور محسوسات کو چھوٹے چھوٹے واقعات کی مدد سے مربوط اور دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ منٹو کی طرح عصمت نے بھی اپنی تحریروں میں بے باکی کا مظاہرہ کیا۔ عصمت کے افسانوں کی دوسری بڑی خوبی دلکش زبان اور طرزِ بیان

© NCERT not to be republished

ہے۔عورتوں کی زبان اور محاوروں پر انھیں قدرت حاصل تھی۔انھوں نے کرداروں کی مناسبت سے طنز و مزاح سے بھی کام لیا۔عصمت نے افسانوں کے علاوہ ناول، ناولٹ، خاکے، ڈرامے، رپورتاژ اور ادبی مضامین بھی لکھے۔

''کلیاں''، ''چوٹیں''، ''چھوئی موئی''، ''دو ہاتھ''، ''دھانی بانکیں''، ''ضدّی''، ''ٹیڑھی لکیر''، ''سودائی''، ''دل کی دنیا''، ''جنگلی کبوتر''، ''عجیب آدمی''، ''ایک قطرۂ خوں'' اور ''معصومہ'' ان کی قابلِ ذکر کتابیں ہیں۔''کاغذی ہے پیرہن'' کے عنوان سے ان کی خود نوشت سوانح بھی شائع ہو چکی ہے۔

© NCERT not to be republished

چوتھی کا جوڑا

سہ دری کے چوکے پر آج پھر صاف سُتھری جازم بچھی تھی۔ ٹوٹی پھوٹی کھپریل کی جھریوں میں سے دھوپ کے آڑے ترچھے قتلے پورے دالان میں بکھرے ہوئے تھے۔ محلّے ٹولے کی عورتیں خاموش اور سہمی ہوئی سی بیٹھی تھیں۔ جیسے کوئی بڑی واردات ہونے والی ہو۔...

آج کتنی آس بھری نگاہیں کبریٰ کی ماں کے متفکر چہرے کو تک رہی تھیں، چھوٹے عرض کی ٹول کے دو پاٹ تو جوڑ لیے گئے تھے، مگر ابھی سفید گزی کا نشان بیونتنے کی کسی کو ہمّت نہ پڑی تھی۔ کاٹ چھانٹ کے معاملہ میں کبریٰ کی ماں کا مرتبہ بہت اونچا تھا۔ ان کے سوکھے سوکھے ہاتھوں نے نہ جانے کتنے جہیز سنوارے تھے، کتنے چھٹی چھوچھک تیار کیے تھے اور کتنے ہی کفن بیونتے تھے۔ جہاں کہیں محلّہ میں کپڑا کم پڑ جاتا اور لاکھ جتن پر بھی بیونت نہ بیٹھتی، کبریٰ کی ماں کے پاس کیس لایا جاتا۔ کبریٰ کی ماں کپڑے کی کان نکالتیں، کلف توڑتیں، کبھی تکون بناتیں، کبھی چوکھٹا کرتیں اور دل ہی دل میں قینچی چلا کر آنکھوں سے ناپ تول کر مسکرا پڑتیں۔

''آستین کے لیے گھیر تو نکل آئے گا، گریبان کے لیے کترن میری بقچی سے لے لو۔''

اور مشکل آسان ہو جاتی۔ کپڑا تراش کر وہ کترنوں کی پنڈی بنا کر پکڑا دیتیں۔

پر آج تو سفید گزی کا ٹکڑا بہت ہی چھوٹا تھا اور سب کو یقین تھا کہ آج تو کبریٰ کی ماں کی ناپ تول ہار جائے گی، جب ہی تو سب دَم سادھے ان کا منھ تک رہی تھیں۔ کبریٰ کی ماں کے پُر استقلال چہرے پر فکر کی کوئی شکل نہ تھی، چار گرہ گزی کے ٹکڑے کو وہ نگاہوں سے بیونت رہی تھیں۔ لال ٹول کا عکس ان کے نیلگوں زرد چہرے پر شفق کی طرح پھوٹ رہا تھا۔ وہ اُداس اُداس گہری جھرّیاں اندھیری گھٹاؤں کی طرح ایک دَم اُجاگر ہو گئیں، جیسے گھنے جنگل میں آگ

بھڑک اٹھی ہو، اور انھوں نے مسکرا کر قینچی اٹھالی۔...

سہ دری کے آخری کونے میں پلنگڑی پر حمیدہ پیر لٹکائے ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے دور کچھ سوچ رہی تھی۔

دوپہر کا کھانا نمٹا کر اسی طرح بی اماں سہ دری کی چوکی پر جا بیٹھتی ہیں اور بقچی کھول کر رنگ برنگے کپڑوں کا جال بکھیر دیا کرتی ہیں۔ کونڈھی کے پاس بیٹھی برتن مانجھتی ہوئی کبریٰ کن انکھیوں سے ان لال کپڑوں کو دیکھتی تو ایک سرخ جھپکی اس کے زردی مائل مٹیالے رنگ میں لپک اٹھتی۔ روپہلی کٹوریوں کے جال جب پولے پولے ہاتھوں سے کھول کر اپنے زانوؤں پر پھیلاتیں تو اُن کا مُرجھایا ہوا چہرہ ایک عجیب ارمان بھری روشنی سے جگمگا اٹھتا ۔ گہری صندوقوں جیسی شکنوں پر کٹوریوں کا عکس ننھّی ننھّی مشعلوں کی طرح جگمگانے لگتا۔ ہر ٹانکے پر زری کا کام ہلتا اور مشعلیں کپکپا اُٹھتیں۔...

اس چہل پہل سے دور کبریٰ شرم کی ماری، مچھّروں والی کوٹھری میں سر جھکائے بیٹھی رہتی۔ اتنے میں کتر بیونت نہایت نازک مرحلے میں پہنچ جاتی۔ کوئی کلی اُلٹی کٹ جاتی اور اس کے ساتھ بیویوں کی مت بھی کٹ جاتی۔ کبریٰ سہم کر دروازے کی آڑ سے جھانکتی۔

یہی تو مشکل تھی۔ کوئی جوڑا اللہ مارا چین سے نہ سلنے پایا۔ جو کلی اُلٹی کٹ جائے تو جان لو نائن کی لگائی ہوئی بات میں ضرور کوئی اڑنگا لگے گا۔... جو گوٹ میں کان آجائے تو سمجھ لو یا تو مہر پر بات ٹوٹے گی یا بھرت کے پایوں کے پلنگ پر جھگڑا ہوگا۔ چوتھی کے جوڑے کا شگون بڑا نازک ہوتا ہے۔ بی اماں کی ساری مشّاقی اور سگھڑاپا دھرا رہ جاتا نہ جانے عین وقت پر کیا ہوجاتا کہ دھنیا برابر بات طول پکڑ جاتی۔ بسم اللہ کے روز سے سگھڑ ماں نے جہیز جوڑنا شروع کردیا تھا۔ ذرا سی کترن بھی بچتی تو تلے دانی یا شیشی کا غلاف سی کر دھنک گوکھرو سے سنوار کر رکھ دیتیں۔ لڑکی کا کیا ہے کھیرے ککڑی کی طرح بڑھتی ہے۔ جو برات آ گئی تو یہی سلیقہ کام آئے گا۔

اور جب سے ابّا گزرے۔ سلیقہ کا بھی دَم پھوُل گیا۔ حمیدہ کو ایک دم ابّا یاد آ گئے ۔ ابّا

کتنے دبلے پتلے لمبے جیسے محرّم کا علم۔ ایک بار جھک جاتے تو سیدھے کھڑا ہونا دشوار تھا۔ صبح ہی صبح اٹھ کر نیم کی مسواک توڑ لیتے اور حمیدہ کو گھٹنے پر بٹھا کر نہ جانے کیا سوچا کرتے۔ اور ابّا کبریٰ کی جوانی کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھتے۔

کبریٰ جوان تھی۔ کون کہتا تھا کہ جوان تھی۔ وہ تو جیسے بسم اللہ کے دن سے ہی اپنی جوانی کی آمد کی سناؤنی سن کر ٹھٹھک کر رہ گئی تھی۔ نہ جانے کیسی جوانی آئی تھی کہ نہ تو اس کی آنکھوں میں کرنیں ناچیں نہ اس کے رخساروں پر زلفیں پریشان ہوئیں ....۔ وہ جھکی جھکی سہمی سہمی جوانی جو نہ جانے کب دبے پاؤں اس پر رینگ آئی، ویسے ہی چُپ چاپ نہ جانے کدھر چل دی۔

ابّا ایک دن چوکھٹ پر اوندھے منھ گرے اور انھیں اٹھانے کے لیے کسی حکیم یا ڈاکٹر کا نسخہ کام نہ آسکا اور حمیدہ نے میٹھی روٹی کے لیے ضد کرنی چھوڑ دی۔ اور کبریٰ کے پیغام نہ جانے کدھر راستہ بھول گئے۔ جانو کسی کو معلوم ہی نہیں کہ اس ٹاٹ کے پردے کے پیچھے کسی کی جوانی آخری سسکیاں لے رہی ہے۔ اور ایک نئی جوانی سانپ کے پھَن کی طرح اُٹھ رہی ہے۔

مگر بی امّاں کا دستور نہ ٹوٹا، وہ اسی طرح روز دوپہر کو سہ دری میں رنگ برنگے کپڑے پھیلا کر گڑیوں کا کھیل کھیلا کرتی ہیں۔ کہیں نہ کہیں سے جوڑ جمع کر کے شبرات کے مہینے میں کریب کا دوپٹہ ساڑھے سات روپے میں خرید ہی ڈالا۔ بات ہی ایسی تھی کہ بغیر خریدے گزارہ نہ تھا۔ منجھلے ماموں کا تار آیا کہ ان کا بڑا لڑکا راحت پولیس کی ٹریننگ کے سلسلے میں آرہا ہے۔ بی امّاں کو تو بس جیسے اک دم گھبراہٹ کا دورہ پڑ گیا۔ جانو چوکھٹ پر برات آن کھڑی ہوئی اور انھوں نے ابھی دلہن کی مانگ کی افشاں بھی نہیں کتری۔ ہَول سے تو ان کے چھکّے چھوٹ گئے۔ جھٹ اپنی منھ بولی بہن بندو کی ماں کو بُلا بھیجا کہ ''بہن میرا مَری کا منھ دیکھو جو اسی گھڑی نہ آؤ۔''

اور پھر دونوں میں کھُسر پھُسر ہوئی۔ بیچ میں ایک نظر دونوں کبریٰ پر بھی ڈال لیتیں جو دالان میں بیٹھی چاول پھٹک رہی تھی۔ وہ اس کانا پھوسی کی زبان کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔

© NCERT not to be republished

اسی وقت بی امّاں نے کانوں کی چار ماشہ کی لونگیں اتار کر منھ بولی بہن کے حوالے کیں کہ جیسے تیسے کر کے شام تک تولہ بھر گوکھرو، چھ ماشہ سلمہ ستارا اور پاؤ گز نیفے کے لیے ٹول لا دیں۔ باہر کی طرف والا کمرہ جھاڑ پونچھ کر تیار کیا۔ تھوڑا سا چونا منگا کر کبریٰ نے اپنے ہاتھوں سے کمرہ پوت ڈالا۔ کمرہ تو چٹّا ہو گیا مگر اس کی ہتھیلیوں کی کھال اُڑ گئی اور جب وہ شام کو مسالہ پیسنے بیٹھی تو چکّر کھا کر دوہری ہو گئی۔ ساری رات کروٹیں بدلتے گزری۔ ایک تو ہتھیلیوں کی وجہ سے، دوسرے صبح کی گاڑی سے راحت آ رہے تھے۔

''اللہ! میرے اللہ میاں! اب کے تو میری آپا کا نصیبہ کھل جائے۔ میرے اللہ میں سو رکعت نفل تیری درگاہ میں پڑھوں گی۔'' حمیدہ نے فجر کی نماز پڑھ کر دعا مانگی۔ صبح راحت بھائی آئے تو کبریٰ پہلے ہی سے مچھّروں والی کوٹھری میں جا چھپی تھی۔ جب سیویّوں اور پراٹھوں کا ناشتہ کر کے بیٹھک میں چلے گئے تو دھیرے دھیرے نئی دلہن کی طرح پیر رکھتی کبریٰ کوٹھری سے نکلی اور جھوٹے برتن اٹھا لیے۔ ''لاؤ میں دھوؤں بی آپا۔'' حمیدہ نے شرارت سے کہا۔

''نہیں۔'' وہ شرم سے جھک گئی۔

حمیدہ چھیڑتی رہی، بی امّاں مسکراتی رہیں اور کریب کے دوپٹہ میں لپّا ٹانکتی رہیں۔ جس راستے کان کی لونگیں گئی تھیں اسی راستے پھول پتہ اور چاندی کی پازیب بھی چل دی اور پھر ہاتھوں کی دو دو چوڑیاں بھی جو منجھلے ماموں نے رنڈاپا اُتارنے پر دی تھیں۔ روکھی سوکھی خود کھا کر آئے دن راحت کے لیے پراٹھے تلے جاتے، کوفتے، بھُنا پلاؤ مہکتے۔ خود سوکھا سا نوالہ پانی سے اتار کر وہ ہونے والے داماد کو گوشت کے لچھّے کھلاتیں۔

''زمانہ بڑا خراب ہے بیٹی۔'' وہ حمیدہ کو مُنھ پھُلاتے دیکھ کر کہا کرتیں۔ اور وہ سوچا کرتی۔ ہم بھوکے رہ کر داماد کو کھلا رہے ہیں۔ بی آپا صبح سویرے اٹھ کر جادو کی مشین کی طرح جُٹ جاتی ہے۔ نہار منھ پانی کا گھونٹ پی کر راحت کے لیے پراٹھے تلتی ہے۔ دودھ اونٹاتی ہے

تا کہ موٹی سی ملائی پڑے۔ اس کا بس نہیں تھا کہ وہ اپنی چربی نکال کر ان پراٹھوں میں بھر دے۔ اور کیوں نہ بھرے۔ آخر کو وہ ایک دن اس کا اپنا ہو جائے گا۔ جو کچھ کمائے گا اس کی ہتھیلی پر رکھ دے گا۔ پھل دینے والے پودے کو کون نہیں سینچتا؟ پھر جب ایک دن پھول کھلیں گے اور پھلوں سے لدی ہوئی ڈالی جھکے گی تو یہ طعنہ دینے والیوں کے مُنھ پر کیسا جوتا پڑے گا اور اس خیال ہی سے میری بی آپا کے چہرے پر سہاگ کِھل اٹھتا۔ کانوں میں شہنائیاں بجنے لگتیں۔ اور وہ راحت بھائی کے کمرے کو پلکوں سے جھاڑتیں۔ ان کے کپڑوں کو پیار سے تہ کرتیں۔ جیسے وہ کچھ ان سے کہتے ہوں۔ وہ ان کے بدبودار چوہوں جیسے سڑے ہوئے موزے دھوتیں۔ بساندی بنیان اور ناک سے لتھڑے ہوئے رومال صاف کرتیں۔ ان کے تیل میں چپچپاتے ہوئے تکیے کے غلاف پر سوئٹ ڈریم کاڑھتیں ۔ پر معاملہ چاروں کونے چوکس نہیں بیٹھ رہا تھا۔ راحت صبح انڈے پراٹھے ڈٹ کر کھاتا۔ اور شام کو آ کر کوفتے کھا کر سو جاتا۔ اور بی امّاں کی منھ بولی بہن حکیمانہ انداز میں کھُسر پھُسر کرتیں۔

''بڑا شرمیلا ہے بے چارہ۔'' بی امّاں تاویلیں پیش کرتیں۔'' ہاں یہ تو ٹھیک ہے پر بھئی کچھ تو پتا چلے رنگ ڈھنگ سے، کچھ آنکھوں سے۔''

''اے نوج، خدا نہ کرے میری لونڈیا آنکھیں لڑائے۔ اس کا آنچل بھی نہیں دیکھا ہے کسی نے۔'' بی امّاں فخر سے کہتیں۔

''اے تو پردہ توڑوانے کو کون کہے ہے۔'' بی آپا کے پکّے مہاسوں کو دیکھ کر انھیں بی امّاں کی دور اندیشی کی داد دینی پڑی۔

''اے بہن، تم تو سچ میں بہت بھولی ہو۔ یہ میں کب کہوں ہوں۔ یہ چھوٹی نگوڑی کون سی بکرید کو کام آئے گی؟'' وہ میری طرف دیکھ کر ہنستی۔

''اری او نک چڑھی! بہنوئی سے کوئی بات چیت، کوئی ہنسی مذاق، اونہہ واری چل دیوانی۔''

© NCERT not to be republished

''اے تو میں کیا کروں خالہ؟''

''راحت میاں سے بات چیت کیوں نہیں کرتی؟''

''بھئی ہمیں تو شرم آتی ہے۔''

''اے ہے، وہ تجھے پھاڑ ہی تو کھائے گا۔'' بی امّاں چڑ کر بولیں۔

''نہیں تو۔ مگر .....'' میں لاجواب ہوگئی اور پھر مسکوٹ ہوئی۔ بڑی سوچ بچار کے بعد کھَل کے کباب بنائے گئے۔ آج بی آپا بھی کئی بار مسکرا پڑیں۔ چپکے سے بولیں۔

''دیکھو ہنسنا نہیں، نہیں تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔''

''نہیں ہنسوں گی۔'' میں نے وعدہ کیا۔

''کھانا کھا لیجئے۔'' میں نے چوکی پر کھانے کی سینی رکھتے ہوئے کہا۔ پھر جو پٹی کے نیچے رکھے ہوئے لوٹے سے ہاتھ دھوتے وقت میری طرف سر سے پاؤں تک دیکھا تو میں بھاگی وہاں سے۔ میرا دل دَھک دَھک کرنے لگا۔ اللہ توبہ کیا خنّاس آنکھیں ہیں۔ ''جانگوڑی ماری اری دیکھ تو سہی، وہ کیسا مُنھ بناتا ہے۔ اے ہے سارا مزا کِرکِرا ہو جائے گا۔''

آپا بی نے ایک بار میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں التجا تھی۔ لَوٹی ہوئی براتوں کا غبار تھا اور چوتھی کے پرانے جوڑوں کی مانند اداسی۔ میں سر جھکائے پھر کھمبے سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔

راحت خاموش کھاتے رہے، میری طرف نہ دیکھا۔ کھلی کے کباب کھاتے دیکھ کر مجھے چاہیے تھا کہ مذاق اڑاؤں۔ قہقہہ لگاؤں کہ ''واہ جی واہ دولھا بھائی! کھلی کے کباب کھا رہے ہو۔'' مگر جانو کسی نے میرا نرخرہ دبوچ لیا ہو....

''کیا ہمارے یہاں کا کھانا آپ کو پسند نہیں آتا؟'' میں نے حَلی کر کہا۔

''یہ بات نہیں۔ کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کھلی کے کباب تو کبھی بھوؤ سے کی ترکاری۔''

© NCERT not to be republished

''میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ہم سوکھی روٹی کھا کے اسے ہاتھی کی خوراک دیں۔ گھی ٹپکتے پراٹھے ٹھنسائیں۔ میری بی آپا کو جو شاندہ نصیب نہیں اور اسے دودھ مَلائی نگلوائیں۔'' میں بھنّا کر چلی آئی۔...

راحت نے پھر کسی بہانے سے مجھے پکارا۔ ''اونہہ!'' میں جل گئی۔ پر بی آپا نے کٹی ہوئی مرغی کی طرح جو پلٹ کر دیکھا تو مجھے جانا ہی پڑا۔

''آپ ہم سے خفا ہوگئیں؟'' راحت نے پانی کا کٹورا لے کر میری کلائی پکڑ لی۔ میرا دم نکل گیا اور بھاگی تو ہاتھ جھٹک کر۔''

''کیا کہہ رہے تھے؟'' بی آپا نے شرم وحیا سے گھُٹی ہوئی آواز میں کہا۔ میں چُپ چاپ ان کا منھ تکنے لگی۔

''کہہ رہے تھے کس نے پکایا ہے کھانا۔ واہ واہ! جی چاہتا ہے کھاتا ہی چلا جاؤں۔ پکانے والی کے ہاتھ کھا جاؤں.....اوہ نہیں.....کھا نہیں بلکہ چوم لوں۔''

میں نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا اور بی آپا کا کھُردرا ہلدی دھنیا کی بساند میں سَڑا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ سے لگا لیا۔ میرے آنسو نکل آئے۔ ''یہ ہاتھ'' میں نے سوچا جو صبح سے شام تک مسالہ پیستے ہیں، پانی بھرتے ہیں، پیاز کاٹتے ہیں، بستر بچھاتے ہیں، جوتے صاف کرتے ہیں۔ یہ بے کس غلام صبح سے شام تک جُٹے ہی رہتے ہیں ان کی بیگار کب ختم ہوگی؟ کیا ان کا کوئی خریدار نہ آئے گا؟ کیا انھیں کبھی کوئی پیار سے نہ چومے گا؟ کیا ان میں کبھی مہندی نہ رچے گی؟ کیا ان میں کبھی سہاگ کا عطر نہ بسے گا؟ جی چاہا زور سے چیخ پڑوں۔

''اور کیا کہہ رہے تھے؟'' بی آپا کے ہاتھ تو اتنے کھُردرے تھے، پر آواز اتنی رسیلی اور میٹھی تھی کہ اگر راحت کے کان ہوتے تو ..... مگر راحت کے نہ کان تھے نہ ناک بس دوزخ جیسا پیٹ تھا۔

''اور کہہ رہے تھے کہ اپنی بی آپا سے کہنا کہ اتنا کام نہ کیا کریں اور جو شاندہ پیا کریں۔''

© NCERT not to be republished

''چل جھوٹی۔''

''ارے واہ جھوٹے ہوں گے آپ کے وہ.....''

''اری چپ مُردار''! انھوں نے میرا منھ بند کر دیا۔

''دیکھ تو سوئٹر بُن گیا ہے انھیں دے آ۔ پر دیکھ تجھے میری قسم میرا نام نہ لیجیو۔''

''نہیں بی آپا۔ انھیں نہ دو وہ سوئٹر۔ تمھاری ان مٹھّی بھر ہڈّیوں کو سوئٹر کی کتنی ضرورت ہے؟'' میں نے کہنا چاہا پر کہہ نہ سکی۔

''آپا بی تم خود کیا پہنو گی؟۔

''ارے مجھے کیا ضرورت ہے؟ چولھے کے پاس تو ویسے ہی جھُلس رہتی ہے۔''

سوئٹر دیکھ کر راحت نے اپنی ایک ابرو شرارت سے اوپر تان کر کہا۔

''کیا یہ سوئٹر آپ نے بُنا ہے؟''

''نہیں تو۔''

''تو بھئی ہم نہیں پہنیں گے۔''

میرا جی چاہا کہ اس کا منھ نوچ لوں کمینے۔ مٹّی کے تودے۔ یہ سوئٹر ان ہاتھوں نے بُنا ہے جو جیتے جاگتے غلام ہیں۔ اس کے ایک ایک پھندے میں کسی نصیبوں جلی کے ارمانوں کی گردنیں پھنسی ہوئی ہیں، یہ ان ہاتھوں کا بُنا ہوا ہے جو ننھّے پنگورے جھلانے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ ان کو تھام لو۔ اور یہ دو پتوار بڑے سے بڑے طوفان کے تھپیڑوں سے تمھاری زندگی کی ناؤ کو بچا کر پار لگا دیں گے۔ یہ ستار کے گت نہ بجا سکیں گے۔ منی پوری اور بھارت ناٹیم کے مدرانہ دکھا سکیں گے۔ انھیں پیانو پر رقص کرنا نہیں سکھایا گیا۔ انھیں پھولوں سے کھیلنا نہیں نصیب ہوا۔ مگر یہ ہاتھ تمھارے جسم پر چربی چڑھانے کے لیے صبح سے شام تک سلائی کرتے ہیں۔ صابن اور سوڈے میں ڈبکیاں لگاتے ہیں چولھے کی آنچ سہتے ہیں۔ تمھاری غلاظتیں دھوتے ہیں تاکہ تم اُجلے چِٹّے بگلا بھگتی کا ڈھونگ رچائے رہو۔ محنت نے ان میں زخم ڈال دیے

ہیں۔ان میں کبھی چوڑیاں نہیں کھنکتی ہیں۔انھیں کبھی کسی نے پیار سے نہیں تھاما۔...

''یہ سوئٹر تو آپ ہی پہن لیجیے۔دیکھیے نا آپ کا کرتا کتنا باریک ہے؟''

جنگلی بلّی کی طرح میں نے اس کا منھ، ناک، گریبان اور بال نوچ ڈالے۔ اور اپنی پلنگڑی پر جا گری۔ بی آپا نے آخری روٹی ڈال کر جلدی جلدی تسلے میں ہاتھ دھوئے۔اور آنچل سے پونچھتی میرے پاس آ بیٹھی۔

''وہ بولے؟'' ان سے نہ رہا گیا۔تو دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

''بی آپا۔ یہ راحت بھائی بڑے خراب آدمی ہیں۔'' میں نے سوچا کہ میں آج سب کچھ بتادوں گی۔

''کیوں؟'' وہ مسکرائیں۔

''مجھے اچھّے نہیں لگتے.....دیکھیے میری ساری چوڑیاں چورہ ہوگئیں۔'' میں نے کانپتے ہوئے کہا۔

''بڑے شریر ہیں۔'' انھوں نے رومانٹک آواز میں شرما کے کہا۔

''بی آپا.....سنو بی آپا۔ یہ راحت اچھّے آدمی نہیں۔'' میں نے سلگ کر کہا۔

''آج میں امّاں سے کہہ دوں گی۔''

''کیا ہوا؟'' بی امّاں نے جانماز بچھاتے ہوئے کہا۔

''دیکھو میری چوڑیاں بی امّاں۔''

''راحت نے توڑ ڈالیں۔'' بی امّاں مسرّت سے بولیں۔

''ہاں''!

''خوب کیا۔تو اسے ستاتی بھی تو بہت ہے۔اے ہے تو دَم کا ہے کو نکل گیا۔ بڑی موم کی بنی ہوئی ہو کہ ہاتھ لگایا اور پگھل گئیں۔'' پھر چمکار کر بولیں۔'' خیر تو بھی چوتھی میں بدلہ لے لیجیو۔ وہ کسر نکالیو کہ یاد ہی کریں میاں جی۔'' یہ کہہ کر انھوں نے نیت باندھ لی۔

© NCERT not to be republished

منھ بولی بہن سے پھر کانفرنس ہوئی۔

''اے ہے تو بڑی ہی ٹھَس ہے۔ اے ہم تو اپنے بہنوئیوں کا خدا کی قسم ناک میں دم کر دیا کرتے تھے۔''...

''یہ بات نہیں ہے بہن، آجکل کے لڑکوں کا دل بس تھالی کا بیگن ہوتا ہے۔ جدھر جُھکا دو اُدھر ہی لڑھک جائے گا۔''

مگر راحت تو بینگن نہیں اچھّا خاصا پہاڑ ہے۔ جھکاؤ دینے پر کہیں میں ہی نہیں پِس جاؤں۔ میں نے سوچا۔ پھر میں نے آپا کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش دہلیز پر آبیٹھیں، آٹا گوندھ رہی تھیں اور سب کچھ سنتی جا رہی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو زمین کی چھاتی پھاڑ کر اپنے کنوارپنے کی لعنت سمیت اس میں سما جاتیں۔...

مگر اشاروں کنایوں کے باوجود راحت میاں نہ تو خود منھ سے پھوٹے اور نہ ہی ان کے گھر ہی سے پیغام آیا۔ تھک ہار کر بی امّاں نے پیروں کے توڑے گروی رکھ کر پیر مشکل کُشا کی نیاز دلا ڈالی۔ دوپہر بھر محلّے ٹولے کی لڑکیاں صحن میں اودھم مچاتی رہیں۔ بی آپا شرمائی لجائی مچّھروں والی کوٹھری میں اپنے خون کی آخری بوندیں چُسانے کو جا بیٹھیں۔... بی آپا کی سہیلیاں ان کو چھیڑ رہی تھیں اور وہ خون کی بچی کُھچی بوندوں کو تاؤ میں لا رہی تھیں۔ آج کئی روز سے ان کا بخار نہیں اُترا تھا۔ تھکے ہارے دِیے کی طرح ان کا چہرہ ایک بار ٹمٹماتا اور پھر بجھ جاتا۔ اشارے سے انھوں نے مجھے اپنے پاس بُلایا۔ اپنا آنچل ہٹا کر نیاز کے ملیدے کی طشتری مجھے تھما دی۔

''اس پر مولوی صاحب نے دَم کیا ہے۔'' ان کی بخار سے دہکتی ہوئی گرم گرم سانس میرے کان میں لگی۔...

''یہ..... یہ ملیدہ۔'' اس نے اُچھلتے ہوئے دل کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔ اس کے پیر لرز رہے تھے۔ جیسے وہ سانپ کی بانبی میں گھس آئی ہو۔ اور پھر پہاڑ کھسکا.....! اور منھ کھول دیا۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔ مگر دور کہیں بارات کی شہنائیوں نے چیخ لگائی۔ جیسے کوئی ان کا گلا گھونٹ

© NCERT not to be republished

رہا ہو۔ کانپتے ہاتھوں سے مقدّس ملیدے کا نوالہ بنا کر اس نے راحت کے منھ کی طرف بڑھا دیا۔

ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پہاڑ کی کھوہ میں ڈوبتا چلا گیا۔ نیچے تعفّن اور تاریکی کے اتھاہ غار کی گہرائیوں میں اور ایک بڑی سی چٹان نے اس کی چیخ کو گھونٹ دیا۔

نیاز کے ملیدے کی رکابی ہاتھ سے چھوٹ کر لالٹین کے اوپر گری اور لالٹین نے زمین پر گر کر دو چار سسکیاں بھریں اور گُل ہوگئی۔ باہر آنگن میں محلّے کی بہو بیٹیاں مشکل کُشا کی شان میں گیت گا رہی تھیں۔

صبح کی گاڑی سے راحت مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوا روانہ ہوگیا۔ اس کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور اسے جلدی تھی۔

اس کے بعد اس گھر میں کبھی انڈے نہ تلے گئے۔ پراٹھے نہ سِکے اور سوئٹر نہ بُنے گئے۔ دِق نے جو ایک عرصے سے بی آپا کی تاک میں بھاگی پیچھے پیچھے آ رہی تھی ایک ہی جَست میں انھیں دبوچ لیا اور انھوں نے چُپ چاپ اپنا نامراد وجود اس کی آغوش میں سونپ دیا۔

اور پھر اس سہ دری میں چوکی پر صاف ستھری جازم بچھائی گئی۔ محلّے کی بہو بیٹیاں جڑیں۔ کفن کا سفید سفید لٹھّا۔ موت کے آنچل کی طرح بی امّاں کے سامنے پھیل گیا۔ تحمّل کے بوجھ سے ان کا چہرہ لرز رہا تھا۔ بائیں ابرو پھڑک رہی تھی گالوں کی سنسان جھرّیاں بھائیں بھائیں کر رہی تھیں۔ جیسے ان میں لاکھوں اژدہے پھنکار رہے ہوں۔

لٹھّے کی کان نکال کر انھوں نے چَو پرتہ کیا اور ان کے دل میں اَن گنت قینچیاں چل گئیں۔ آج اُن کے چہرے پر بھیانک سکون اور ہرا بھرا اطمینان تھا۔ جیسے انھیں پکّا یقین ہو کہ دوسرے جوڑوں کی طرح چوتھی کا یہ جوڑا سینتا نہ جائے گا۔

ایک دم سہ دری میں بیٹھی لڑکیاں، بالیاں میناؤں کی طرح چہکنے لگیں۔ حمیدہ ماضی کو دور جھٹک کر ان کے ساتھ جا ملی۔ لال ٹول پر.....سفید گزی کا نشان! اس کی سرخی میں نہ جانے کتنی

معصوم دلہنوں کا سہاگ رَچا ہے اور سفیدی میں کتنی نامراد کنواریوں کے کفن کی سفیدی ڈوب کر اُبھری ہے اور پھر سب ایک دم خاموش ہوگئے۔ بی امّاں نے آخری ٹانکا بھر کے ڈورہ توڑ لیا۔ دو موٹے موٹے آنسو ان کے روئی جیسے نرم گالوں پر دھیرے دھیرے رینگنے لگے۔ ان کے چہرے کی شکنوں میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ نکلیں اور وہ مسکرا دیں۔ جیسے آج انھیں اطمینان ہوگیا کہ ان کی کبریٰ کا سوہا جوڑا بن کر تیار ہوگیا ہو اور کوئی دم میں شہنائیاں بج اٹھیں گی۔

مشق

لفظ و معنی

سہ دری	:	تین دروازوں والا دالان
جازم	:	فرش پر بچھائی جانے والی گُل بوٹے والی بڑی چادر یا چاندنی
واردات	:	واقعہ، جو بات پیش آئے۔ اسی لیے جرم کو ہی واردات کہتے ہیں مثلاً فلاں جگہ ایک واردات ہوگئی
ٹول	:	لال رنگ کا سوتی کپڑا
پاٹ	:	چوڑائی خاص کر کپڑے یا ندی کی
چھٹی	:	بچّے کی پیدائش کے چھٹے دن کی تقریب
چھوچھک	:	دودھ پلانے والی دائی، وہ سامان جو چھٹی کے دن بچے اور اس کی ماں کے لیے ماں کے گھر سے آتا ہے
بیونت	:	کاٹ، تراش
پنڈی	:	کترنوں کو ایک ساتھ لپیٹنا

© NCERT not to be republished

استقلال	:	مستقل مزاجی، ٹھہراؤ
گرہ	:	گز کا سولہواں حصّہ
چارگرہ	:	گز کا چوتھائی حصّہ
نیلگوں	:	نیلے رنگ کا
کونڈی	:	چھوٹا کونڈا جو اکثر مٹی یا پتھر کا بنا ہوتا ہے
روپہلی	:	چاندی یا چاندی کے رنگ کی
مَت کٹ جانا	:	عقل ماری جانا
شگون لینا	:	کسی کام کو شروع کرنے سے پہلے یہ معلوم کرنے کی کوشش کہ اس کا کرنا ٹھیک ہوگا یا نہیں، ایسی بات جس سے آئندہ ہونے والی بات کا اندازہ ہو سکے
مشّاقی	:	مہارت
دھنک گوکھرو	:	دوپٹے کے کنارے پر لگایا جانے والا گوٹا، گوٹا جس میں ہلکے ہلکے کانٹے ہوتے ہیں
علَم	:	جھنڈا
سناونی	:	موت کی خبر
لَپّا	:	دوپٹے پر ٹانکی جانے والی کرن
پھول، پتہ، پازیب	:	مختلف زیورات کے نام۔ پھول اور پتہ کان کے زیور ہیں پازیب ایک زنجیر ہے جسے ٹخنوں کے اوپر باندھتے ہیں
رنڈاپا اتارنا	:	عِدّت کی مدّت ختم ہونا
حکیمانہ	:	دانش مندانہ
تاویل	:	بہانہ، توجیہہ

© NCERT not to be republished

مسکوٹ	:	خفیہ صلاح ومشورہ
خنّاس	:	شیطان
نرخرہ	:	سانس کی نالی
مٹی کے تودے	:	مٹی کے مادھو
گَت	:	دُھُن
مُدرا	:	بھاؤ بتانا
بانبی	:	بِل
تحمّل	:	برداشت کی طاقت
چوپرتہ کرنا	:	چارتہیں بنانا

غور کرنے کی بات

- اس افسانے میں بہت سے ایسے الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے جو زیادہ تر عورتیں استعمال کرتی ہیں۔ جیسے: چھٹی چھوچھک۔ لپا چھپ۔ آگ لگے موئے کو۔ خاک پڑے۔ اری چل دیوانی۔ مسکوٹ۔ مجھ مَری کا منہ دیکھو۔ نگوڑی۔ کم بخت۔ نامراد۔
- شادی بیاہ اور بچوں کی پیدائش وغیرہ کے موقع پر عموماً طرح طرح کے وہموں میں مبتلا ہوجاتی ہیں۔ مثال کے طور پر اس افسانے میں چوتھی کے جوڑے کی تیاری کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ اگر اس جوڑے کی کتر بیونت میں کہیں غلطی ہوجائے تو کس کس طرح کی رکاوٹیں پیدا ہوسکتی ہیں۔ اگر چہ تعلیم کے عام ہوجانے کی وجہ سے اس میں کمی واقع ہوئی ہے۔ تاہم گاؤں دیہات میں اب بھی ساعت، شگون اور رسم و رواج کی بڑی پابندی کی جاتی ہے۔ اور اگر ان میں کسی طرح کی کمی ہوجائے یا کوئی کسر باقی رہ جائے تو اسے بدشگونی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

© NCERT not to be republished

- اس افسانے میں محاوروں اور کہاوتوں کا برمحل استعمال کیا گیا ہے۔

سوالات

1. کبریٰ سہ دری کی چہل پہل سے دور کیوں رہتی تھی؟
2. راحت کے آنے کی خبر سن کر بی امّاں کے چھکّے کیوں چھوٹ گئے؟
3. ''جس راستے کان کی لونگیں گئی تھیں، اسی راستے پھول، پتہ اور چاندی کی پازیب بھی چل دی۔'' اس جملے کا کیا مطلب ہے اور اس سے کبریٰ کے گھریلو حالات پہ کیا روشنی پڑتی ہے؟
4. راحت کے کردار کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

عملی کام

- اس افسانے میں ایسے بہت سے بامحاورہ جملوں کا خوب صورت استعمال کیا گیا ہے آپ ان جملوں کی نشان دہی کیجیے، اور ان محاوروں کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔
- اس افسانے میں آپ کو کون سا کردار سب سے زیادہ پسند آیا اور کیوں؟ دلیلوں کے ساتھ بیان کیجیے۔
- اس افسانے کا موضوع ہمارے موجودہ حالات کی کیا ترجمانی کرتا ہے؟

© NCERT not to be republished